مرزا غالب کی فارسی شاعری — (ایک جائزہ)

(ڈاکٹر شمس الدین احمد)

مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی رح کے فارسی کلام کے بارے میں غائر مطالعات کی روشنی میں کام کرنا ابھی باقی ہے۔ یہ موضوع اس قدر جاذب اور اہم ہے کہ غالب کی فکری جہتوں کے ادراک میں بہت بڑا معاون ثابت ہو سکتا ہے بالخصوص جبکہ خود میرزا ای موصوف نے اپنے فارسی کلام میں نقشہائے رنگ رنگ کی دل آویزی کا نظارہ کرنے کی دعوت دی ہو۔ جبکہ انھوں نے اپنے فارسی کلام کو شرعیت شعر کی ایزدی کتاب کہا ہو اور خاص کر اس لئے بھی جبکہ ارباب ذوق و حال اور فاضلان قیل و قال نے ابھی تک اسی عمق نظر اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا تجزیہ نہیں کیا جس سنجیدگی، وسعت نظر بلکہ فکر کی گہرائی کے ساتھ میرزا غالب کے اردو کلام کا کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مقالہ میں غالب کے گوناگوں نقوش کی فارسی کلام میں موجود رنگ آمیز لبوں، دلکشیوں اور نوسازلبوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس مقالہ میں غالب کے فارسی کلام کی بس دو ایک خصوصیات پر اکتفا کروں گا۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا بھی محض ایک بیان ہوگا تجزیہ نہیں۔

پس منظر کے طور پر یہ کہنا لازمی ہے کہ غالب نے فارسی شعر میں وہی اسلوب برتا ہے جو اب فارسی ادب میں بغلط سبک ہندی یعنی ہندوستانی اسلوب کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان میں اس اسلوب کے پیشروؤں میں ناصر علی سرہندی، غنی کشمیری اور بیدل کے نام زیادہ معروف ہیں۔ بیدل نے ہندوستانی اسلوب کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس

سانچے کی ظاہری شکل وصورت کو ہندوستانی قالب سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ بیدل کے ابتکاری استعارے اور ترکیبیں ہندوستانی فارسی شاعری کو دائمی آب و رنگ بخش چکے ہیں۔

مرزا غالب اوّل اوّل بیدل سے بحد متاثر رہے اگرچہ بقول خود غالب نے شیخ علی حزیں کے خندہ زیر لبی کی بیراہروی سے گریز کیا، طالب کے زہر نگاہ اور عرفی شیرازی کی آنکھوں کی برق نے ان کی لغزشوں کو جلا کر خاک کر دیا، اور ظہوری کے نقش کی گہرائی نے انہیں تقویت بخشی لیکن انصاف سے کہنا پڑتا ہے کہ غالب کا اسلوب ایک جداگانہ چیز تھی کیونکہ بعد میں وہ فنِ شعر کے اس نقطۂ عروج پر پہنچے جہاں وہ ان موصوف کی روشنیوں سے بے نیاز ہو گئے غالب نے بالآخر اپنے بے پناہ تجربوں، اپنی وسعت فکر و نظر اور اعجاز بیان و زبان کے تار و پود سے وہ قبا بنائی جو بقول فرخی "تنیدہ ز دل، بافتہ ز جان"، تھی سال استادان سخن سے استفادہ کرنے کی طرف غالب نے جو اشارہ کیا ہے وہ یقیناً ان کے فارسی میں شعر کہنے کے ابتدائی دور کی بات ہو گی۔ بعد میں اس شاہراہ پر جب ان کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو انہوں نے اپنے لئے ایک الگ راہ بنالی یہی وہ راستہ ہے جس میں انہوں نے لالہ زار کھلائے، رنگ رنگ کے پھول لگائے بعد دور دور رنگ شگوفوں کی قطاریں سجا دیں۔ اس چمن زار کو سر سبز و شاداب اور سدا بہار بنانے کیلئے غالب نے گداز نفس، نالوں کی تاب اور حرارت، پلکوں کی خونفشانی، دل و جگر کے خونناب بعد برق گداز آہوں کو مصرف میں لایا ہے اور اسی کو مرزا غالب نے نقشہای رنگ رنگ کا نام دیا ہے۔ یہ نقشہای رنگ برنگ اور چیزوں کے علاوہ جن کی تفصیل کی یہاں مجال نہیں، ان کی جدت طرازی، تخیل کی رفعت، انفرادی انداز بیان، معنی آفرینی، شوخ نگاری، اسلوب کا تنوع، تخیل کی شگفتگی اور بداعت تعبیر پر مشتمل ہے ان تمام خصوصیات میں ہندوستانی فارسی شاعری میں غالب منفرد ہیں۔ اپنی اس انفرادیت یا احساس خودی و برتری کا خود انہوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔

باهن میاویزای پدر فرزند آذر را نگر | ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد
رند ہزار شیوہ را طاعت حق گران نبود | لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست
متہم بہر کہ پیش از وجود لوح و قلم | نگاشتہ شیوۂ تحریر کردہ ام تلقین
قلم ز نسبت دستم نہال روضۂ خلد | ورق ز صنعت کلکم نگار خانۂ چین

در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب | این آیۂ خاص است کہ بر من شدہ نازل

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی | مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بسومنات خیالم در آئی تا بینی | روان فروز برو دوشہای زناری

مرزا غالب کے فارسی کلام کی برجستہ ترین خصوصیت ان کی معنی آفرینی ہے۔ یہ معنی آفرینی کا ہی کرشمہ ہے کہ گرانبار اور خشک موضوعات میں رنگینی اور دلکشی پیدا کر دیتی ہے بشرطیکہ اس اہم شعری خصوصیت کو درست اور صحیح طور پر کلام میں برتا جائے یعنی نہ ان حدود سے تجاوز کرے جو شعر کے ثبات حسن کے لئے مقرر ہیں اور نہ بقول ظہوری راہ سخن میں ایسے سنگ ریزے ڈال دیئے جائیں جن سے اسپ بیان کو آسیب پہنچے۔ جس حسن و خوبی کے ساتھ مرزا غالب نے اس خصوصیت کو اپنے کلام میں برتا ہے اس سے ان کے کلام کی انفرادیت ایک ابدی حسن اور لازوال کیفیت سے سرشار ہو گئی ہے۔

دانہ و دام کے تانے بانے سے فارسی شعراء نے جو خیالبافی کی ہے وہ زلف و خال کی حدود سے آگے نہ بڑھی۔ اس موضوع پر تقریباً سبھی شاعروں کے نغمے اس شعر کی صدای باز گشت ہیں کہ

خال بکنج لب یکی، طرۂ مشکفام دو | وای بحال مرغ دل، دانہ یکی و دام دو

لیکن مرزا غالب کی نکتہ آفرین اور جدت پسند طبیعت نے اس روایتی شگفتگی کو نظر انداز کرکے دانہ و دام سے بالترتیب اپنی بالیدگی کی ہوس اور ستمہای روزگار کے محبس کے نئے اور لطیف و بلیغ معانی پیدا کئے۔ فرماتے ہیں:

ہوسِ ما و دانہ از یکدست — نفسِ ما و دام از یک نخ

پہلے مصرعہ میں دانہ اور دست اور دوسرے میں نفس اور نخ کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے علاوہ نہ صرف بیان بھی نیا ہے بلکہ تخیل بھی۔ دانہ و دام ایک پامال مضمون ہے۔ لیکن اپنے قوتِ بیان اور اپنی فکر کی پختگی سے غالب نے اس مضمون کی وہ نو سازی کی ہے کہ گویا اس مضمون کی تجدید بنیاد ہو گئی ہے جو قدیم سے بالکل الگ اور انوکھی ہے اور اس تعمیر میں وہ نقوش اور رنگ بھر دئے کہ نئے آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو گئی ہے۔

اسی مفہوم کا ایک بلیغ اور پُر کیف شعر سنئے:

دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد — در انتظار ہما دام چیدہ ام بنگر

دانہ کے تدریجی ارتقاء کو اپنی ذات کے نشو و نما کے ساتھ متعلق کر دینا نہ صرف ابداع ہے بلکہ شاعر کی متانتِ فکر، لطافتِ ذہن اور کنہ شگافی کی انتہا ہے شعر کی زبان نئی ہے شعر کا لب و لہجہ جدا ہے انداز بیان نیا ہے اور فکر بھی نئی۔ انتظار ہما کو تلاشِ محال کے ساتھ یا خوب سے خوب تر کی لازمی تلاش کے ساتھ منسلک کرکے نہ صرف شعر موجودہ دور کے جدید ذہن کا نمائندہ ہی بن جاتا ہے۔ بلکہ اس شعر کی جہتوں کے بیشمار افق نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

غالب لذت پرست تھے۔ وہ آگ کے شعلوں پر رقصِ خس سے بھی مزے لیتے تھے، زخم جگر کے نمکدان میں ڈوب جانے سے بھی لذت یاب ہوتے تھے اور پارہای دل پر تمنا کی چوٹ لگ جانے سے بھی محظوظ ہوتے تھے اور یہ چیز ان کی اس وجدانی کیفیت کا نتیجہ بھی جو عشق سے ماورا تھی یہی وجہ ہے حسن کا عنصر جو غالب کے جذبۂ لذت پرستی کیلئے تازیانے کا کام دیتا ہے غالب کے کلام میں بہت زیادہ نمایاں ہے غالب کی حسن پرستی مشرق کی روایتی حسن پرستی نہیں

کہ ایک سے زیادہ محبوبوں پر جان و دل نچھاور نہ کئے جائیں، وہ اس حیثیت سے کبھی روایت شکن تھے کہ انہوں نے مادی حسن کا جہاں کہیں بھی مشاہدہ کیا وہاں اس سے لذت اندوز ہوئے خواہ وہ دلی کی ستم پیشہ ڈومنی تھی یا خواہ بنارس کے قیامت قامت اور مژگان دراز محبوب۔

گر بمعنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است ★ خم زلف و شکن طرف کلاہی دریاب

بیا کہ فصل بہار است و گل بہ صحن چمن ★ کشادہ روئی تر از شاہدان بازار است

گلت را لو از گشتن را تماشا ★ تو داری بہاری کہ عالم ندارد

نشان زندگی دل دمید لذت ہالیت ★ جلائی آئینۂ چشم دیدن است مخسپ

غالب کی اسی فکری اساس کا ادراک کر کے اقبال نے جنت کی حور سے کہلوایا تھا ؎

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئی ــــ تپد آن زمان دل من پی خوبتر نگاری

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابی ــــ سر منزلی ندارم کہ بمیرم از قراری

تجربوں کی اسی بے پناہ وسعت کی تحصیل پر اپنے کلام کی بنیاد رکھنے کی وجہ سے غالب کے اشعار کا ساختمان، رنگِ ثبات دوام کا حامل بن گیا ہے اور جہاں اس نے ان تجربوں کو جمالیاتی انداز میں بیان کیا ہے، وہاں ایک کیفیتِ سرمدی، ایک حالِ بے قال، اور سرودِ مستی کی ایک وہ فضا تخلیق کی ہے جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے بیان نہیں کی جا سکتی۔ معنی آفرینی کی ایک برتر صورت یہی ہے مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

نقشی آئینہ برابر نہ و صورت بنگر ــــ پارہ ای گوش بمن دار و معانی بشنو

{محبوب سے کہتے ہیں: ذرا آئینہ اپنے سامنے لے آؤ اور اپنی صورت کو اس میں دیکھتے جاؤ، ساتھ ہی میری طرف بھی دھیان رکھو اور اپنی صورت کے معنی مجھ سے سنتے جاؤ}

اس شعر میں عاشق معشوق سے سب کچھ کہہ گیا ہے۔ معشوق کی صورت معانی ہے صورت نہیں ہے معشوق خود عاشق خواہ ہے جب ہی عاشق اٹھے آئینہ سامنے رکھ کر اس سے صورت دیکھنے کا تقاضا کر رہا ہے آئینہ کی حیرانی کی کہانی بھی عاشق، در پردہ معشوق کو سنا

Scanned with CamScanner

رہا ہے جو آئینہ بظاہر ساکن ہے لیکن عالمِ سرمستی میں معشوق کے حسن کی طرف لپک رہا ہے چنانچہ شاعر پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جانے سے اُسے آئینہ متحرک نظر آ رہا ہے اس ایک شعر میں مرزا غالب نے اردو کے کئی اشعار کے معنی سمو دئیے ہیں[1] اور یہ اُن کی فارسی زبان پر قدرت ہونے کے علاوہ ان کے عمیق اور لطیف جذبے کی برہانِ قاطع ہے۔

ایک اور خاص بات جو اس شعر پر غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ مرزا غالب صورت پرستی کی حدود سے آگے بڑھ کر خالص ذوقِ حسن کے پرستار تھے یعنی وہ صورت پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ معنی تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ ایک شعر میں اتنے معانی کو سمو دینا معنی آفرینی کی معراج ہے بقول غالب: "اگر شعر (غالب نے ریختہ کہا ہے) بپایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور؟" اور یہ معنی الشعر کے استعمال کا کرشمہ ہے جس کی داد وہی دے سکتے ہیں جو فارسی زبان کی سحر کاریوں سے واقف ہیں۔ معنی آفرینی کے یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

شنیدہ کہ بآتش نسوخت ابراہیم　　ببین کہ بی شرر و شعلہ می توانم سوخت
ریحان دمد از مینا ز کشش چکد از قلقل　　آن دردِ چشم افگند این از لب گوش آورد
بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاب　　بخلوتم بر و ساغر کشیدنم بنگر
فدای شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار　　بعذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

میں نے یہ چند مثالیں ان کی غزلوں سے دی ہیں اور غالب کی معنی آفرینی کی خصوصیت ان کے دیگر اصناف سخن قطعہ، قصیدہ، مخمس، ترکیب و ترجیع بند، مثنوی اور رباعی سب

---

[1] تماشا کر اے محوِ آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر　　پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
اس چشمِ فسونگر کا اگر پائے اشارہ　　طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے　　جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

Scanned with CamScanner

میں برجستہ طور پر نظر آتی ہے۔

غالبؔ کے کلام کی ایک اور خصوصیت جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، غالبؔ کا جوش بیان ہے جس میں وہ اپنی بنیادی جدّت طرازی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں اگرچہ یہ خصوصیت اُن کے تمام اصناف سخن پر حاوی ہے لیکن میں یہاں اُن کی مثنوی ابرِ گہربار کی روشنی میں ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

مثنوی ابرِ گہربار کا مجموعی تاثر ایک شکایت نامے کا سا ہے اگرچہ یہ مثنوی حمد اور منقبت وغیرہ کی بھی حامل ہے، اس مثنوی کی جان مناجات کا وہ حصّہ ہے جس میں غالبؔ نے اللہ سے گلہ کیا ہے اور ایک رندِ ہزار شیوہ کی سی بیباکی مگر خلوص نیّت کے ساتھ اپنے انفرادی انداز میں دل کی تمنّا کو ایک شدید احساسِ اندوہ کے ساتھ بیان کیا ہے اس مناجات میں غالبؔ وہ سب کچھ کہہ گیا ہے جو تمہاری روزگار کا رہین ایک نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کہہ سکتا تھا، نور بیان رنگِ تمثیل اور جدّتِ ادا کے علاوہ الفاظ کا جلال، فن کارانہ سحر، اور خلوصِ جذبات کے بالاترین صفات کی حامل یہ مثنوی اس لحاظ سے بلا مبالغہ ہندوستان کے فارسی ادب میں غم روزگار کے اظہار بیان میں نہ صرف کم نظیر ہے بلکہ شاہکار بھی ہے۔

مثنوی ابرِ گہربار میں ظاہری خوبصورتی بھی ہے اور باطنی حسن بھی، اس میں شوکت و جلال ہے اور لطافت و جمال بھی، یہ مثنوی آرزوؤں کے فریب خوردہ ایک سادہ دل آدمی کے روح کی پکار ہے، یہ افضل مخلوقات کی اس دنیا میں پامال و زبون حال بن جانے کی المیہ داستان ہے اور خالق و مخلوق کے باہمی رشتے سے پیدا ہوئے ایک مغلوب بندے کی پکار ہے جو اپنے جذبات و احساسات کو ہمہ گیر تجربوں اور نفسیاتی گہرائیوں کی روشنی میں بیان کرکے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کراہ رہا ہے، یہ مثنوی ایک الہام ہے اس میں گداز دل سے پیدا شدہ آتش کا ایک سیلاب رواں ہے، اس میں شاعر کے عطیۂ اندیشہ کی حرارت

بھی ہے اور اضطراب و بے چینی بھی۔ زیر مثنوی آشوب آگہی کا تلاطم بھی ہے اور تلاطم کے بعد کا سکون بھی ہے! اس لحاظ سے میرے خیال میں اگر مرزا غالب سے اُن کے فارسی آثار میں یہی ایک مثنوی باقی رہ جاتی جب بھی ہم اُن کی فارسی دانی، فنکاری اور اُن کے آشوب آگہی سے قائل ہو جاتے۔ زیر مثنوی غائر مطالعہ کے نتیجے میں ہمیں غالب کے اس شعر کا مومن بنا دیتی ہے کہ

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ